منیر رپورٹ سے منیر رپورٹ تک

(جسٹس منیر کی کتاب *From Jinnah to Zia* پر تبصرہ)

نعیم صدیقی

مرتبین

مراد علوی

اسد جبینؔ

منیر رپورٹ سے منیر رپورٹ تک

(ریٹائرڈ جسٹس منیر صاحب کی تازہ کتاب پر ایک نظر)

یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ۱۹۷۹ء کی ایک اہم کتاب ہو گی، میں نے اپنے مصروف اوقات میں خاص طور سے گنجائش نکالی کہ اسے بغور پڑھوں۔ میرا اشارہ ہے، ریٹائرڈ فاضل جسٹس منیر کی کتاب *From Jinnah to Zia* کی طرف۔ مجھے افسوس ہوا کہ دس ڈالر کی اس چھوٹی سی کتاب میں کوئی نیا مواد نہیں بلکہ وہی کچھ ہے جسے منیر رپورٹ میں پڑھ چکا تھا۔ منیر رپورٹ جس دور سے متعلق تھی اس کی گرما گرمی سے گرز کر جب میں نے اس پر غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ فاضل مرتب کا کچھ ذہنی کامپلکس[complex] ہے جس نے لفظوں، لکیروں اور نقطوں کی شکل میں ایک عنکبوتی جالے کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ رپورٹ کے صفحات پر عنکبوتی جالا اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ تحقیقاتی عدالت کے قیام کا اصل منشا غتر بود ہو گیا ہے۔ ہاں ایک فوقیت یافتہ شخص کو جو اتفاق سے اضطرابات پنجاب [Punjab Disturbances] کی تحقیقاتی عدالت کا صدر بھی تھا، کاروائی پر حاوی بھی رہا، اور جس نے نتائج تحقیقات کی رپورٹ بھی مرتب کی[1]، اس نے کچھ ذہنی آسودگی ضرور حاصل کرلی۔ یہ راے میں نے اس وجہ سے قائم کی ہے کہ جس زور سے اس رپورٹ میں سیکولرازم کی تبلیغ کی گئی ہے اور پڑھنے والے کے ذہن پر اسے ٹھونسنے کا اہتمام کیا گیا ہے، نیز

---

[1] - Report of the Court of Inquiry constituted under Punjab act II of 1954 to enquire into the Punjab disturbances of 1953 (Lahore: Lahore Printed by the Superintendent, Government printing, Punjab 1954)

جس بُری طرح اسلام کو چوکے لگانے کے لیے علما کو نشانۂ تحقیر و تمسخر بنایا گیا ہے۔ یہی یک طرفہ انتہا پسندانہ رنگ کسی بڑے ذہنی ردِ عمل کا سراغ دیتا ہے۔ اس ذہنی ردِ عمل نے ساری بحث و گفتگو کو توازن سے محروم کر دیا ہے۔ یہی نہیں، اس میں وہ حقیقی شائستگی اور پابندی آداب ملحوظ نہیں ہے جو سنجیدہ سطح پر علمی —— خاص طور پر دینی —— موضوعات پر اختلافی گفتگوؤں میں شرفا کا شعار ہے۔ یہاں تو صاف طور پر جنابِ متکلم اپنے حق میں نہ صرف دعوائے علم رکھتے ہیں —— بلکہ کسی قدر کبرِ علم —— علم بھی محض دنیوی یا قانونی امور تک محدود نہیں، بلکہ دین و شریعت کا علم بھی شاملِ دعویٰ ہے۔ ادھر دوسرے فریق کی کوتاہی علم اور اس کی کم فہمی کا تذکرہ بھی ہے اور ساتھ ہی تضحیک بھی۔ خصوصاً یہ امر قابلِ غور ہے کہ تحقیقاتی عدالت کا جج صحیح طور پر ایک غیر جانب دار جج نہیں رہتا، بلکہ وہ خود فریق بن جاتا ہے۔

میں بزرگ فاضل جسٹس منیر صاحب کے احترام واجب میں ذرا سا فرق لائے بغیر یہ کہتا ہوں کہ ردِ عمل سے پیدا ہونے والی انتہا پسندی کا زہر قومی مسائل کا تجزیہ کرنے والی لیبارٹری کے تمام کیمیاویات میں حل ہو گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس رپورٹ کے اندر قومی بلکہ دینی مسائل زہر آلود ہو کر سامنے آئے ہیں۔ کیا قوم کے روپے اور صدہا افراد کے وقت کا ایسا استعمال معقول تھا؟

دس ڈالر کی لاگت کی یہ کتاب در حقیقت اس حادثے کا نوحہ ہے کہ منیر رپورٹ مر چکی ہے —— اور وہ تو جنم لینے کے ساتھ مر چکی تھی۔

انسان کے لیے یہ تجربہ بہت دردناک ہوتا ہے کہ اس کی فکری یا اعتقادی ہستی اس کے سامنے موت کے گھاٹ اُتر جائے۔ یہ تو جسٹس منیر کی ہمت ہے اور ہمیں اس کی داد دینی چاہیے کہ وہ خاموشی کا ایک لمبا وقفہ گذار کر جب موقع پاتے ہیں، منیر رپورٹ کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور سیکولرازم کا وعظ سنانے لگتے ہیں حتیٰ کہ اگر ان کی بات کو کوئی نہ سن رہا ہو، کہیں اثر نہ پڑ رہا ہو، کسی دماغ میں تبدیلی نہ آ رہی ہو، تب بھی وہ منیر رپورٹ کی باتیں کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ ہی کو مخاطب بنا لیتے ہیں۔ بات سیکولرازم کی سہی مگر استقامت و استواری کی اپنی جگہ بڑی قدر و قیمت ہے۔ اس تکرارِ کلام کا ایک مقصد اپنے آپ کو مر جانے والی فکر کے زندہ ہونے کا یقین دلانا بھی ہے۔

فاضل جسٹس منیر نے اپنی کتاب میں پوری منیر رپورٹ کا خلاصہ دوہرایا ہے، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رپورٹ کا ذکر کر کے خوش ہوتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں، بلکہ ہو سکتا کہ کوئی نفسیاتی تجزیہ کار ان کی تحریر میں "نرگسیت" [Narcissism] کا سراغ لگا لے۔

منیر رپورٹ کی شانِ عالی

لیجیے آپ رپورٹ کے متعلق جسٹس صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے کیوں کہ داناؤں کا نظریہ یہ مشہور ہے کہ "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں"[۲]۔ جسٹس صاحب کی "نیک بیانی" (تلخیص کردہ) کی ایک جھلک:

---

[۲]۔ مصنف اپنی تصنیف کو بہتر بیان کر سکتا ہے۔

"یہ بڑی لمبی تحقیقات تھی، مگر ایک خوش گوار اور دلچسپ کام تھا۔ یکم مئی ۱۹۵۳ء کو آغاز ہوا اور ۱۰/ اپریل ۱۹۵۴ء کو رپورٹ داخل کر دی گئی۔ اس میں ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل تحریری بیانات شامل ہیں ۲۷۰۰ صفحات شہادتوں کے ہیں ۳۳۹ دستاویزات لی گئی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات خطوط کے لیے وقف ہیں۔ بے شمار کتابیں، پمفلٹ، رسائل اور اخبارات شامل ہیں۔ عدالتی تحقیقات کا اصل رپورٹ ۳۸۷ مطبوعہ صفحات پر حاوی ہے۔"[3]

اس رپورٹ کے بعد پاکستان کے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر میں اس رپورٹ کے حوالے ملیں گے۔

بیشتر پاکستانی اخبارات نے اس پر زور دار تبصرے کیے۔ بعض نے سرخیوں میں اسے "ایک عظیم دستاویز" (A Great Document) اور " ایک تاریخی دستاویز" (A Historcial Document) قرار دیا۔ انگلستان اور آسٹریلیا میں بھی جرائد نے تبصرے کیے۔[4]

پروفیسر حتی [Phiip Khuri Hitti] نے تاثراتی خط لکھا اور ملاقات میں کہا کہ میں پاکستان سے ایسی کسی چیز کے نمودار ہونے کی توقع کر رہا تھا۔[5]

---

[3] - Muhammad Munir, *From Jinnah to Zia* (New Dehli: Akbar Ali Khan at New Dehli Press, 1981), 41.

[4] - Ibid., 42.

[5] - Ibid.

کینیڈا کے ایک پروفیسر نے لکھا کہ میں نے اپنے طلبہ کے لیے موسمِ گرما کے مطالعاتی پروگرام میں اس رپورٹ کو شامل کیا ہے۔[6]

رپورٹ اور شاہ ایران

سب سے زیادہ قابلِ توجہ شاہ ایران کی دلچسپی کا ذکر اور اس کے ساتھ منیر صاحب کا دردمندانہ تاثر ہے۔ منیر صاحب بتاتے ہیں:

"شاہ ایران نے مجھ سے رپورٹ کے متعلق پوچھا تو میں نے بتایا کہ اس میں کیا کیا ہے اس پر انھوں نے فرمایا کہ ایسے ہی مسائل ان کے یہاں بھی درپیش ہیں۔"[7]

یہاں بڑے حسرت و حرماں کے ساتھ جسٹس منیر فرماتے ہیں کہ:

"آج ایران میں خمینی کے ہاتھوں انقلاب آچکا ہے۔ اسلامی ری پبلک کا قیام عمل میں آرہا ہے۔ شاہ اور ملکہ میکسیکو (Mexico) میں پناہ گزین ہیں (نوٹ: کتاب کی اشاعت کے بعد شاہ کے ستارے نے اور بھی گردشیں کرلی ہیں) اور بہت سے سر جن شاہ کی حمایت کا سودا تھا، قلم ہو چکے ہیں۔"[8]

ان کلماتِ حسرت و حرماں کو پڑھ کر یہی خیال آتا ہے کہ شاہ (اور ملکہ) کی تقدیر اگر اچھی ہوتی تو وہ پاکستان سے جسٹس منیر کو بلواتے اور اپنے ہاں ایک تحقیقاتی عدالت لگوا کر تمام

---

[6] - Ibid.
[7] - Ibid.
[8]- Ibid.

علما اور مجتہدین کو اس میں پیش کرا دیتے۔ پھر منیر صاحب ان کو طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے اور خود اسلام کے قلب و جگر میں سیکولرازم کے نشتر سے عملِ جراحی کرنے کے بعد ایک ایرانی منیر رپورٹ مرتب کرتے۔ پھر نہ خمینی کی بات کوئی سنتا، نہ دوسرے علما کی دال گلتی، نہ شاہ اور ملکہ کو تخت اور وطن چھوڑنا پڑتا اور نہ کسی شاہ پرست کا سر قلم ہوتا۔ امن چین کی شاہی چلتی رہتی۔

گویا منیر صاحب کے پاس روایتی کہانیوں کا کوئی "اسمِ اعظم" تھا، جس کے طلساتی عمل سے سیاسی مدّ و جزر کو روکا جاسکتا تھا اور تاریخ کے دھارے کا رخ موڑا جاسکتا تھا۔ کون منیر صاحب کی خدمت میں عرض کرنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ دنیا کی تاریخ تحقیقاتی عدالتوں کی رپورٹوں[9] سے نہیں بنتی جن کے مرتبین کا کمرۂ عدالت سے باہر عوامی سیاست کے دائرے میں کوئی مقام نہیں ہوتا، اور جن کا سارا احترام قانونِ انسداد توہینِ عدالت کے بل پر قائم ہوتا ہے،۔ تاریخ کو تبدیل کرنے والے عوامل کا تعین اس واقعہ کی توجیہ سے ہوسکتا ہے کہ مکہ کے دارالندوہ کے عالیشان ایوان میں جو سردارانِ قریش عبا و قبا کے ساتھ کثیر تعداد میں مشورے کیا کرتے تھے، ان کو ایک غریبانہ سے خانۂ ارقم میں سر چھپانے والے فقیروں کے ذکر و فکر کس طرح زک دے دی۔

خیر جسٹس منیر صاحب کو ہم کیوں مجبور کریں کہ وہ سیکولرازم کی بے جان میت کو الگ رکھ کر تاریخ پر اثر ہونے والے عوامل کا کھوج لگائیں۔ البتہ ان سے ہم یہ ضرور پوچھنا

---

[9]۔ جسٹس منیر صاحب کا زعم یہی ہے کہ اس رپورٹ میں ایسا طلسمی اثر موجود ہے۔

چاہتے ہیں کہ آپ کی نظر میں آیت اللہ خمینی کی اسلامی ری پبلک کتنی بھی بری ہو، آخر اس نے ریفرنڈم کرایا ہے۔ دستور تیار کرایا ہے۔ انتخابات کرا رہی ہے۔ اس کے بالمقابل آپ میں شاہ پرستی کیوں ہے؟ آپ کو علامہ خمینی سے یہ توقع کیوں تھی وہ شاہ کے نظامِ ظلم کے ان آلہ ہائے کار کی بندوقوں اور تلواروں کو چومتے جنھوں نے حالیہ انقلاب میں کئی ہزاروں سروں کی فصل کاٹی اور جنھوں نے شاہ کے دور میں سیاسی اور دینی حلقوں سے صدائے اختلاف اٹھانے والے ہر آدمی کا صفایا کر دیا۔ یہاں تک کہ شاہ کے تخت کے پائے ہمیشہ ایران کے بے گناہ مسلمانوں کے خون میں ڈوبے رہے۔ شاہ کیسا بھی خانہ بر اندازِ چمن بنا رہا ہو اور اس کے ان گنت کُشتگانِ ناز کے لاشے چپے چپے پر تڑپتے رہے ہوں۔ ان کے خیال سے تو جسٹس صاحب کے کانوں پر جُوں تک کبھی نہ رینگی، مگر اب خون خوار بادشاہت کے چہیتے قاتلانِ عوام کی نسبتاً بہت کم تعداد کو کیفر کردار تک پہنچانا آں جناب کو سخت ناگوار گذر را ہے۔

یہ فرق شاید اس لیے کہ شاہ بہر حال سیکولرسٹ ہونے کے لحاظ سے جسٹس منیر صاحب کا ہم مشرب تھا۔ اور کوئی سیکولرسٹ اگر کشتوں کے پشتے بھی لگا دے تو بر حق۔ مگر آیت اللہ خمینی چوں کہ اسلامی ری پبلک قائم کرنے کا جرم کر چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے دور میں کسی بدترین خون ریز کی نکسیر بھی پھوٹے تو مقامِ ماتم و اضطراب ہے۔

رپورٹ کا کراماتی اثر

اب جسٹس صاحب کا ایک اور دلچسپ نکتہ اپنی رپورٹ کی شان میں سنیے۔ ارشاد کی تلخیص یہ ہے:

"انکوائری کمیٹی کی رپورٹ حکومت کو پیش کرنے کے بعد اسلامی ریاست کا مطالبہ سرد پڑ گیا۔ علما پس منظر میں دھکیل دیے گئے۔ پھر کوئی آواز ۱۹۶۲ء سے پہلے نہ اٹھی۔ جب کہ جماعت اسلامی کے ایک آدمی[۱۰] نے کابینہ میں اسلام کو نظریہ پاکستان قرار دیا۔"[11]

یہاں واشگاف طور پر منیر صاحب نے اپنی رپورٹ کی "کرامات" بیان فرمادی ہیں اور اس مقام پر ایک دبا دبا سا اظہار فخر و مباحات محسوس ہوتا ہے۔ مگر کیا حالات کے متعلق یہ واقعی صحیح بیان(Statement) ہے؟

بہ طورِ خلاصہ اس وقت کا نقشہ احوال پیش کرتے ہوئے میں یہ اشارہ ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی دستور سازی میں سب سے بڑی حائل قوت سیکولر، آزاد منش مغرب پسند طبقے کی تھی جس نے ہر مرحلے پر تاخیر بے جا سے کام لیا۔ اور ہر بار دودھ میں مینگیاں ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش کی وجہ سے دستور سازی کا پہلا اقدام قرارداد مقاصد

[۱۰]- یہ غالباً ذکر ہے مشرقی پاکستان کے مرحوم بیرسٹر اختر الدین صاحب کا جو ایوب خان صاحب کی کابینہ میں تھے، مگر اس وقت وہ جماعت اسلامی کی نمائندگی کی پوزیشن میں نہ تھے۔

[11] - Munir, *From Jinnah to Zia*, XVII.

پاس کرنے کی صورت میں مارچ ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد ستمبر ۱۹۵۰ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ سامنے آئی۔ یہ نہ صرف قرارداد مقاصد سے کُھلا تضاد رکھتی تھی بلکہ مختلف اداروں، جماعتوں، اخبارات اور علما نے اسے "کتاب و سنت" کے ساتھ خیانت ــــ "اسلام کے نام پر سٹنٹ" ــــ "دینی تصور میں تحریف" ــــ اسلام اور جمہوریت دونوں کو چکمہ ــــ "شہری آزادی کا خون" ــــ" ۱۹۳۶ء کے ایکٹ سے بدتر" ــــ قرار دیا گیا اور مطالبہ اٹھا کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ اور یہی حشر اس کا ہوا۔[۱۲] پھر اٹھارہ ماہ تک فضا ٹھنڈی رہی۔ (یہ تحقیقاتی عدالت سے پہلے کی بات ہے) اس سناٹے کو پھر مولانا مودودی مغفور نے توڑا۔ اور مئی ۱۹۵۲ء تک مطالبۂ اسلامی دستور اسلامی کی تحریک کی دوسری لہر اٹھا دی۔ ۸ نکاتی دستوری مطالبہ سامنے لا کر تقاضا کیا گیا کہ ۱۹۵۲ء کے خاتمے تک دستور بنایا جائے۔ ملک بھر میں مد و جزر پیدا ہو گیا اور خواجہ ناظم الدین نے جو وزیر اعظم تھے، بنیادی کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ دسمبر ۱۹۵۲ء میں پیش کر دی۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں تمام گروہوں کے علما نے اس متفقہ ترامیم پیش کر دیں۔ اور علما کا یہ اتفاق ۱۹۵۱ء کے بعد دوسری بڑی تاریخی مثال ہے۔ یہی ۱۹۵۳ء تھا جس کہ اضطرابات پنجاب کا ظہور ہوا۔ اور مولانا مودودی اور ان کے بہت سے رفقا جماعت گرفتار کر لیے گئے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت ختم ہو گئی۔ پھر محمد علی بوگرا مسندِ حکومت پر آ گئے۔ غلام محمد کے زیر سایہ محمد علی بوگرا نے ایک "عبوری دستور" کا شوشہ کھڑا کیا۔ مگر عوامی فضا ایسی تھی اور اُسے مؤثر

---

[۱۲]- رائے عام کا تفصیلی ریکارڈ" دستوری سفارشات اور ان پر تبصرہ" کے زیر عنوان جمع شدہ ہے اور یہ کتاب نشر و اشاعت جماعت پاکستان نے شائع کی تھی۔

رکھنے کے لیے رابطہ عام اور اشاعتی ذرائع سے کام کرنے والے اتنا کام کر رہے تھے کہ شوشہ چل نہ سکا۔ اگر یہ خلا کا دور ہوتا تو سیکولر دستور بن کر چل جاتا۔ بوگرا صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ۱۹۵۴ء کے آخر تک دستور پیش کر دیں گے اور ۱۹۵۴ء ہی وہ بد قسمت سال تھا کہ دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔ اور خوف و دہشت کی تاریکیاں پھیلا دی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ مغرب پرست اکابر اپنی مرضی کا دستور بنا سکیں۔[۳۱] مگر ۱۹۵۵ء میں جب نئی دستور سازی اسمبلی آگئی اور اس نے کام شروع کر دیا تو اسلامی دستور کا مطالبہ پھر زور پکڑ گیا۔ اسی سال مولانا مودودی مغفور رہا ہو گئے اور انھوں نے اسلامی دستور کے لیے پھر عوامی تحریک کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ کہ ۱۹۵۶ء کا دستور مرتب ہوا اور چودھری محمد علی کی سربراہی میں نافذ ہوا۔ اب اس دستور کے تحت ہونے والے انتخابات کو ڈھائی سال تک موخر کیا گیا۔ اور اس درمیانی وقفے میں محلاتی سازشوں کا خوب زور رہا اور پھر اس دستور سے جان چھڑانے کے لیے سکندر مرزا نے سے جمہوریت ہی کو ایسی ٹھوکر لگائی کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ صرف مارشل لارہ گیا۔ (غالباً منیر رپورٹ کی اصل کرامات)۔

اس لمبی کہانی کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ منیر صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو یاد دلایا دیا جائے کہ نہ صرف یہ کہ منیر رپورٹ کے آنے سے تحریک اسلامی دستور

---

[۳۱]- یہی وہ زمانہ تھا ہے جب کہ مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ اور مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی کا ظہور ہوا جس کے متعلق بری خوشی کے ساتھ جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ دونوں کے منشوروں میں اسلام یا قرآن یا سنت کا کوئی ذکر نہ تھا۔ (VIII) یعنی سیکولر جماعتیں بنیں۔ (VIII) مگر یہ مصنوعی جماعتیں کتنی پادر ہوا ثابت ہوئیں۔

میں کوئی خلا واقع نہیں ہوا۔[14] بلکہ تشکیل پاکستان سے لے کر اب تک اسلامی عوام اپنا کام کر رہے ہیں۔ بات آگے لے چلنے میں بڑے ادب سے کہوں گا کہ کوئی جج چاہے وہ ریٹائر نہ ہوا ہو، یہ استحقاق نہیں رکھتا کہ وہ تاریخ جس طرح چاہے تصنیف کر دے۔ تاریخ کسی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ نہیں ہے کہ لکھنے والا جو رنگ بھرنا چاہے اس میں بھر دے۔

ایک اور کلمۂ مدح

منیر رپورٹ کے ایک اور مداح کلمہ ستائش بڑا دلچسپ ہے۔ جسٹس منیر نے اپنے نشۂ نرگسیت میں اسے بھی جوں کا توں نقل کر دیا ہے وہ کوئی صحافی ہے جس نے جسٹس رپورٹ کی تحسین یوں کی ہے کہ آج تک دو ہی کتابیں میرے مطالعہ میں ایسی آئیں، جنھیں شروع سے آخر تک پڑھے بغیر چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ پہلی تھی " لیڈی چڑلے کا عاشق" (*Lady Chatterley's Lover*)[15] اور دوسری منیر رپورٹ۔[16] داد دیجیے صحافی کی مہارت بیان کو کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نے دونوں کتابوں کو مساویانہ اہمیت دے کر مدح کی ہے یا ذم۔ اسی لیے جسٹس صاحب بھی کہہ اٹھے کہ " کیا ہی تقابل ہے؟" (What a

---

[14] - اگر ضرورت ہو تو منیر صاحب کی خدمت میں ایسی بہت سی تقریروں اور تحریروں کا ریکارڈ پیش کیا جا سکتا ہے جو عین اس زمانے میں کی گئیں جس کے متعلق وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا تذکرہ ختم ہو گیا۔ اور علما گمنامی کے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ ۱۹۶۲ء کے ایوبی دستور میں آخر اسلامی ریاست کی اصطلاح کہاں سے آ گئی؟

[15] - David Herbert Lawrence, *Lady Chatterley's Lover* (London: Martin Secker, 1932)

[16] - Munir, *From Jinnah to Zia*, 43.

(comparison)[17] اس شخص نے رپورٹ کی تعریف صرف اس لحاظ سے کی ہے کہ وہ اتنی دلچسپ تھی کہ تسلسل توڑے بغیر اسے پڑھا۔ یہ تعریف لیڈی چیڑلے والے ناول[18] ہی کی نہیں، کسی جاسوسی کہانی، کسی کوک شاستر، کسی کتاب لطائف کی بھی کی جاسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ صحافی مذکورہ کے لیے اصل سامان دلچسپی یہی ہو کہ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر احوال و معاملات کی گردنیں کس طرح مروڑی جاسکتی ہیں اور معزز ترین شائستہ بیان لوگوں کے بیانوں کے فصد جرح کے نشتروں سے کیسے کھولے جاسکتے ہیں، دوسروں کے طرز فکر اور ان کے مدعا کو خود انہی کے منہ پر بدلنا اور بات کچھ کا کچھ بنا کر دکھانا ایک ایسی کاروائی ہے جس کی دلچسپی میں تو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ وہی ایک صحافی نہیں اس ملک کے ہزاروں ذی شعور افراد کے ساتھ راقم الحروف بھی ججی کے ان پہلوؤں کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا ہے۔

---

[17] - Ibid.

[18]- "لیڈی چیڑلے" میں اس کے "عاشق" کے جنسی کرتوتوں کو نکال دیا جائے تو پھر اسے کون خریدے اور پڑھے۔ ہمارے ہاں محبت ایک پاک صاف باطنی جذبے کا نام ہے مگر انگریزی میں جو چیز Love کہلاتی ہے اس کا زیادہ تر مفہوم جسموں کی حرکات پر ہوتا ہے یعنی وہاں کے سیکولر حیوانِ ناطق کا عاشق "نطق" سے آغاز کرتا ہے، "نُقل" (کھانے پینے) کو ذریعہ قرب بناتا ہے، تھوڑی سی نقل و حرکت (اکٹھے ویک اینڈ گذارنے کے لیے کسی ساحلی مقام کا رخ کرنا) سے گرما گرمی پیدا کرتا ہے پھر زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ حیوانیت کا پورا ڈرامہ اوپن اترا اسٹیج پر پیش کر دیتا ہے راستہ چلتے ہوئے یا پارکوں اور سیر گاہوں میں ہر جگہ یہ سیکولر Love ہوتی ملے گی لیڈی چیڑلے وہ ناول ہے جو تادیر ممنوع الاشاعت رہا مگر اب چھپتا ہے کیوں کہ معاشرہ فحاشی کے میدان میں اس سے دس قدم آگے جاچلا ہے۔ لیڈی چڑلے کے عاشق پر Love کے دورے بکثرت پڑتے ہیں۔ کبھی بستر پر، کبھی جنگل کی جھاڑیوں میں کبھی غسل خانے میں اور ناول نگار تمام مواقع کی تصاویر کھینچا جاتا ہے۔ یہ شان ہے سیکولرسٹ معاشرے کی۔ اسلام میں یہ خوش فعلیاں کہاں؟ اسی لیے تو جسٹس منیر نے اسلام سے ناراض ہو کے یہ رپورٹ لکھی۔

منیر رپورٹ کے مداح صحافی کو رپورٹ اس لیے متذکرہ ناول کے مساوی درجے پر پسند آئی کہ یہ کہانی سیکولر ازم کے ایک سچے محب (Lover) کی ہے ساری رپورٹ ڈراما ہے مختلف کردار آتے ہیں، ڈائیلاگ بولتے ہیں کچھ پارٹ ادا کرتے ہیں اور اوجھل ہو جاتے ہیں صرف ہدایت کار چیف ایکٹر بن کر شروع سے آخر تک ہر سین میں موجود رہتا ہے۔ دوسرے ہر کردار کے کندھے پر ہدایت کار صاحب یا خود سوار ہو جاتے ہیں یا سوار ہونے کی بار بار کوشش کرتے ہوئے گرتے ہیں اور غصے میں آجاتے ہیں۔ سوار ہو جائیں تو جس سے جو مکالمہ چاہیں کرالیں۔

پس ہم بھی دل کھول کر داد دیتے ہیں کہ یہ رپورٹ ایک متوسط صحت مند ڈرامے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔

جماعت اسلامی پر تبصرہ

جسٹس صاحب اپنے مداحوں کا تذکرہ کرنے بعد فرماتے ہیں کہ:

" پھر اس رپورٹ پر کوئی تنقید نہیں کی گئی سوائے اس کے جو جماعت اسلامی کی طرف سے ہوئی"۔[۱۹]

مگر جماعت اسلامی (بحالاتِ موجودہ کالعدم) کی اس تنقید کو بے وزن قرار دینے کے لیے جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ:

---

[19] - Munir, *From Jinnah to Zia*, 42.

وہ[جماعت] جسے ہم نے اضطرابات کی ذمہ داری میں حصہ دار قرار دیا ہے۔"[20]

تاثر یہ پیدا کرنا مطلوب ہے کہ جماعت کا تبصرہ تو ناراضگی کی وجہ سے تھا کیوں کہ ہم نے خرابی احوال کی ذمہ داری (جزوی طور پر) اس پر ڈالی ہے۔

ہم آگے چل کر اس تبصرے کے چند اہم نکات پیش کریں گے تاکہ ایک بار پھر حقائق کو اس طرح تازہ کر دیا جائے جسے منیر صاحب نے رپورٹ کے اسرار و معارف کا خلاصہ از سرِ نوع شائع فرما دیا ہے کوئی بھی انصاف پسند آدمی جماعت کے تبصرے کے ان نکات کو——یا ضرورت ہو تو پورے تبصرے کو——خود مطالعہ کر کے دیکھ سکتا ہے کہ منیر رپورٹ کے متعلق جو تنقیدی بحث کی گئی ہے وہ کہاں تک درست ہے اور اس کی روشنی میں منیر رپورٹ کی صحیح قدر و قیمت کیا قرار پاتی ہے۔[21]

---

[20] - Ibid,. 43.

[21]۔ منیر صاحب بھی اپنے اس ترجیحی مقام کو جانتے ہیں اور ہم بھی اعتراف کرتے ہیں کہ وہ سرکاری عدالتی منصب کی وجہ سے سرکار کی تیار کی ہوئی رپورٹ کو تمام دوسری حکومتوں اور سیاسی، علمی اور تحقیقی اداروں تک پہنچا سکتے ہیں بلکہ خود حکومت نے اسے پہلے ہی پہنچا دیا ہے۔ منیر صاحب تو اب جو کتاب بھی لکھیں گے، یورپ امریکہ اور برطانیہ میں اسے ضرور توجہ سے پڑھا جائے گا، خصوصاً اسلام دشمن مستشرقین اور مخالف علما سیکولرسٹ اس کی بڑھ چڑھ کر قدر کریں گے اور منیر صاحب کے بہم کردہ مواد کو مسلم تحریکات کے خلاف استعمال کریں گے۔ منیر صاحب کی رپورٹ کو اگر گھر کے لوگوں نے چوم کے سینے سے نہیں لگایا ہے تو باہر کے لوگ ان نے ایک ایک لفظ کو موتیوں میں تولیں گے۔ منیر صاحب نے علما کے حوالے سے اسلام کو ایسی شکل دے کر اغیار کے سامنے رکھا ہے کہ جہاں کہیں اسلامی اسپرٹ کے ساتھ مسلمان تجدید حیات کے لیے اٹھیں گے اغیار کی پروپیگنڈہ مشینری منیر صاحب کے فراہم کردہ مواد کو موثر طور سے کام میں

میں اس امر پر حیرت زدہ ہوں کہ جسٹس منیر صاحب نے اپنے مداحین کے خیالات تو اس کتاب میں پیش کر دیے ہیں وہ اگر انصاف پسند ہوتے تو رپورٹ کے متعلق جو واحد تبصرہ ان کے سامنے آیا تھا اس کا بھی خلاصہ خود بیان کرتے اور جو سوالات اس میں اٹھائے گئے ہیں ان کا جواب دیتے۔ جسٹس صاحب سے اتنا بھی تو نہیں ہو سکا کہ اس واحد تبصرے کے بارے میں دو چار تاثراتی سطریں ہی لکھ دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جسٹس صاحب کا موقف اتنا کمزور ہے اور ان کے تحقیقاتی کام میں اتنے ٹیڑھ ہیں کہ وہ جراءت نہیں کر سکتے کہ ایسے شخص یا جماعت کی بات پر توجہ دیں جو ان کی کمزوریوں کو نمایاں کر دے۔

جسٹس صاحب کی ایک خصوصی کمزوری بذریعہ تحقیقاتی عدالت یہ واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات منوانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں کہ مگر دوسروں کے بہتر نقطہ نظر کا اعتراف کرتے ہیں اور نہ کوئی بات قبول کرتے ہیں۔ چناں چہ ۱۹۵۳ء سے لے کر اب تک جو عرصہ گذرا ہے اس میں کیا کیا کچھ ہوا اور کیا منیر صاحب کے سامنے آیا مگر حرام ہے جو رتی بھر بھی کوئی تبدیلی انھوں نے اپنی ۲۷ سال پہلے کی آرا میں قبول کی ہو۔ ایسی ضدی اور متحجر شخصیتیں قوموں کی بہبود کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔

لائے گی۔ عدالتی سٹیج پر کھڑے ہو کر اسلام کو ناپسند کرنے والی دنیا کے سامنے منیر صاحب نے اسلام کا ایک ایسا مسخ شدہ چہرہ پیش کیا ہے کہ جسے دیکھ کر خوف و دہشت پھیل جائے۔ کیسی اعلیٰ تبلیغِ اسلام ہے اور کیسی نادر خدمت پاکستان۔ اس پہلو سے جب رپورٹ پر نظر جاتی ہے تو ان لوگوں کی اس بات میں کشش معلوم ہوتی ہے کہ منیر رپورٹ کو ضبط قرار دینا چاہیے، مگر اب اگر ایسا ہو بھی تو بعد از وقت ہو گا جس کا فائدہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ رپورٹ کی طرف دنیا کی توجہات بطور خاص مبذول ہو جائیں۔

منیر صاحب کے لیے لمحہ مسرت

زیرِ مطالعہ کتاب کے ابتدائی اوراق میں جب منیر صاحب کا یہ اشارہ میری نظر سے گذرا کہ اسلام مغربی اور مشرقی پاکستان کو وابستہ رکھنے میں بہت ہی کمزور رشتہ ثابت ہوا[22] تو مجھے منیر صاحب کی مسرت پنہاں پر بہت صدمہ ہوا۔

قضیہ اگر یوں ہو کہ کسی شخص کو چار آدمی پکڑ کر اس کا بازو کاٹ دیں تو کیا یہ کہنا درست ہو گا کہ بدن کی وحدت قائم رکھنے والی فطرت بہت کمزور نکلی؟ لمبی سازشوں کے بعد سابق مشرقی پاکستان کی بھارت نواز آبادی کو تیار کر کے، نیز روسی دوستی اور اسلحہ اور اسرائیلی مہارت جنگ سے استفادہ کر کے مشرقی پاکستان کو الگ کر لیا گیا تھا تو اس میں اسلام کا کیا قصور، وسطی ملیشیا، قازقستان اور روسی ترکستان کی ریاستوں کے مسلمان اگر چالیس برس تک روسی تسلط کے خلاف لڑتے لڑتے دم توڑ گئے تو اس سانحہ کی ذمہ داری اسلام کی کسی کمزوری پر کس طرح آتی ہے؟ مغربی امپریل ازم کی یلغار کے خلاف عرب افریقی اور ایشیائی ممالک نے جو شاندار مزاحمت دکھائی اس کا ایک بڑا محرک اسلام تھا اب اگر جغرافی اور مادی وجوہ سے اور مسلمانوں کی اپنی بعض نادانیوں یا کمزوریوں کے باعث ہمارے اکثر و بیشتر ملک مغربی تسلط میں چلے گئے تو اس میں اسلام کی کس کوتاہی کا دخل تھا؟ اسلام نے شروع کی ہر مزاحمت میں بھی بڑا حصہ لیا ہے اور بعد میں غلامی کے خلاف اٹھنے والی مسلم تحریکات میں بھی اس کا غیر معمولی اثر دیکھا جا سکتا ہے، بلکہ یہ اسلام ہی ہے جو مغرب کے فکری تسلط کے خلاف یون

---

[22] - Munir, *From Jinnah to Zia*, 10.

صدی سے مسلمانوں کو احیائے اسلام کے محاذ پر جمع کر کے معرکے لڑا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیکولر ازم کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ اور سیکولرسٹ حضرات تو مہر بہ بلب کو تہہ خانوں میں جا بیٹھے ہیں یا ان میں اگر کوئی شخص منیر صاحب کی طرح اپنے نظریات کو نمایاں کرتا ہے تو وہ اس قوم میں تنہا رہ جاتا ہے۔ اس کے نظریات دلوں اور دماغوں میں جڑ نہیں پکڑتے۔

پھر منیر صاحب کو سوچنا یہ بھی چاہیے تھا کہ پاکستان کا مغربی حصہ ہو یا مشرقی اس میں معاشرہ اسلامی اساس پر عملاً پوری طرح تعمیر نہیں ہو چکا تھا بلکہ ایک قوم اس خواہش کے ساتھ اٹھی تھی کہ یہ سارا نظامِ حیات اسلامی کے اصولوں پر استوار کرنا ہے۔ اور اسی ارادے کی وجہ سے عالمی طاقتوں اور مختلف ممالک و اقوام پاکستان کے اس ارادے کو ایک "خطرہ" سمجھتی تھیں اور اس کے لیے ایڈ اور ماہرین اور معاہدوں اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعے پاکستان کو گھیر گھار کر سیکولر ازم کی راہ کی طرف ڈالنا چاہتی تھیں۔ نیز اسی غرض سے وہ ہمارے اندر کے سیکولرسٹوں کو دستور سازی کے ابتدائی مراحل سے لے کر تا ایندم پاکستان کی گاڑی کو رُخ موڑنے کے لیے استعمال کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اس منصوبے میں پوری طرح کامیابی نہ ہونے پر انھوں نے اسے کمزور کرنے کی سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ مشہور کتاب "پاکستان کٹ ٹو اِٹس سائز"[۲۳] کے عنوان ہی کا مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کا دماغ درست کر دیا گیا ہے۔

---

[23] -D.R. Mankekar, *Twentytwo fateful days Pakistan cut to size* (Bombay: Manaktalas, 1967).

منیر صاحب نے اور ان کے ہم خیال اس حقیقت پر بھی غور فرمائیں کہ جو علیٰحدگی، لڑائی، جھگڑے اور خون خرابی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کو دونوں خطوں کے عوام اور ان کی حکومتوں نے فراموش کر کے از سرِ نو تعلقاتِ اخوت استوار کرنا شروع کر دیے ہیں۔ کیا یہ اسلام ہی نہیں جس کا اثر بار بار تاریخ میں نمودار ہوتا ہے؟ اس کوشش میں بھی ہزار طرح کی رخنہ اندازیاں ہوسکتی ہیں کیوں کہ مسلم حکومتیں معاندت اور انتقام کی جذبات رکھنے والی طاقتوں میں گھری ہوئی ہیں۔

آخر میں جسٹس منیر اور ان کے ہم خیالوں سے گذارش ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے نقشے کو دیکھیں جس میں برپا ہونے والی ہر نزاع وکشمکش بالعموم دینی یا نظریاتی بنیاد رکھتی ہیں۔ سوشلسٹ حکومتوں اور تحریکوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ غیر سوشلسٹ قوتوں کے خلاف محاذ آرا ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی قبرص اور اریٹریا اور فلسطین اور جنوبی فلپائن میں دینی بنیادوں پر معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ عیسائی دنیا سے آپ مثال چاہیں تو برطانیہ میں آئرلینڈیوں کی جدوجہد پیش کی جاسکتی ہے۔

اس گفتگو کی تکمیل کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ متحدہ وطنی قوتیں قطعی طور پر ناکام ہوچکی ہیں۔ جہاں کہیں اس قسم کی کوئی مصنوعی قوم موجود ہے۔ وہاں ایک مصیبت برپا ہے۔ دور نہ جائیں، بھارت کے سیکولر نظام میں مسلمانوں کو جن بتاہ کن بلوؤں کا سامنا وقفے وقفے پر ہو رہا ہے، آسام اور تھائی لینڈ کے مسلمانوں پر مسلمان ہونے کی وجہ سے جو آزمائش آئی ہوئی ہے اور کموچیا اور ویت نام میں مسلمانوں کو جس طرح تباہ کیا گیا ہے، ان سارے

حالات کا جائزہ لے بھی اگر کوئی شخص دین کو اجتماعی دائرے سے الگ رہ کر سیکولر ازم کے خیال گھوڑے دوڑاتا ہے تو ایسے آدمی کی خوش فہمیوں پر رحم کھانا چاہیے۔

جسٹس صاحب! سیکولر ازم کا فلسفہ ایجاد ہو کر تجربوں سے گذرا اور اب ناکامی سے دوچار ہے۔ پھر آخر یہ کیا مصیبت ہے کہ آپ نہ صرف یہ کہ خود اس کا جھنڈا اٹھائے کھڑے ہیں بلکہ دوسروں سے بھی چاہتے ہیں کہ وہ اس کو سلامی دیں۔ اب تو وقت آگیا ہے کہ ہر ملک میں سیکولر ازم کا مزار بنایا جائے اور اس کے لیے کسی بہترین سیکولرسٹ کو مجاور بنا کر اس پر بٹھایا جائے۔

پاکستان کے مشرقی حصّے کی علیٰحدگی سے اگر اسلام کے خلاف آپ سیکولر ازم کا کیس مضبوط ہوتا ہو تو پھر یہ بتایئے کہ خود سیکولر ازم کیوں سیکولر ازم سے ٹکراتا ہے؟

محترم جسٹس صاحب! تاریخ بڑی پیچیدہ چیز ہے۔

پاکستان میں سیکولر نظریہ کی کمر ٹوٹ چکی ہے

ایران اور افغانستان کے احوال کا تجزیہ، اور ان کی توجیہ تو رہی الگ، خود پاکستان کی دستور سازی کے دائرے میں سیکولر ازم کی پے در پے شکستیں عبرت آموز ہیں۔ اور منیر صاحب کی تازہ کتاب کا بھی مرکزی کیس یہ ہے، قائد اعظم ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر

کے مقتضیات کے مطابق ایک ماڈرن سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے، مگر بعد کے لوگوں[۲۴] نے (مراد ہیں خان لیاقت علی خاں اور سردار نشتر سے لے کر ایوب، بھٹو تک سبھی لوگ) سفینے کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔ اس دعوے کا تجزیہ تو ہمیں شاید آگے جاکر کرنا پڑے۔ البتہ اس سے متعلق دو ایک اہم تاریخی مواقع کا تذکرہ آئے گا۔

کسی بھی سیکولرسٹ کے لیے پہلا امید افزا صدر ایوب کا دورِ حکومت تھا۔

---

[۲۴]- اول قائد اعظم کی ۱۱/ اگست والی تقریر کو ان کے تمام دوسرے ارشادات سے ٹکرا دینا، جو پاکستان بننے سے پہلے اور بعد میں سامنے آئے، بہت بڑی زیادتی ہے۔ ایسی زیادتی اگر کوئی جج کرے تو پھر اس زیادتی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر ممکن ہوا تو ہم قائد اعظم کے ارشادات کا باقاعدہ تجزیہ کر کے دکھائیں گے کہ انھوں نے کیا چاہا یا اور کیا کیا؟ بعدہ یہ سوال دریافت طلب ہے کہ آیا قائد اعظم اپنے خیالات میں فرد واحد تھے؟ نہ خان لیاقت علی خاں اور سردار عبد الرب نشتر اور دوسرے لیڈر ان سے متفق تھے، نہ بہ حیثیت مجموعی مسلم لیگ یہ جانتی تھی کہ انھوں نے کیا راز کی بات کہی ہے یا جانتی تھی تو مانتی نہ تھی اس سے بھی آگے گذر کر تحریک پاکستان کو چلانے اور اس کے لیے قربانیاں دینے والے عوام کو بھی ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان کا ذہن کس طرح تیار کیا جاتا رہا تھا۔ اور ۱۱/ اگست والی تقریر کے بعد کیا وہ قائد اعظم کا ساتھ چھوڑ کر یکایک اُلٹے راستے پر چل نکلے۔ ان ساری صورتوں سے آسان اور ہلکا فیصلہ یہ ہو سکتا ہے کہ منیر صاحب نے شخصِ واحد کی حیثیت سے ۱۱/ اگست کی تقریر کا جو مفہوم سمجھا وہ غلط تھا۔ اگر اسے غلط نہ مانا جائے تو پھر تمام مسلم لیگ، اس کے تمام لیڈروں، تمام علما اور تمام عوام کو غلط ماننا ہو گا۔ اور یہ دعویٰ کرنا ہو گا کہ قائد اعظم اپنے نقطۂ نظر میں فرد تنہا تھے یا زیادہ سے زیادہ جسٹس منیر ان کے ساتھ تھے نہ باقی ساری قوم دوسرے طرزِ فکر کی تھی۔ اگر ایسا تھا تو جمہوری لحاظ سے بات تو وہی چل سکتی تھی جس کی قائل ساری قوم تھی۔ براہ کرم جسٹس منیر صاحب اپنا ریکارڈ درست کریں۔

منیر صاحب کہتے ہیں کہ صدر ایوب بڑے وسیع المشرب آدمی تھے۔ جبھی تو ماڈرن اسلام اور بیسک ڈیمو کریسی کے علم بردار تھے۔ جج صاحب اس فوجی حکمران کی تعریف میں کہتے ہیں کہ اس نے صرف ایک بار اسلام پر تقریر کی تھی[۲۵] یہ الگ بات ہے کہ تھوڑے بہت ریمارکس اسلام کے بارے میں وہ موقع بہ موقع دے لیتے۔ یہی سیکولر آدمی کی پسند کی بات ہے کہ مسلمانوں کا حکمران جو شخص ہو، وہ اسلام کو بہت زیادہ موضوع سخن نہ بنائے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے سیکولرازم کو نقصان پہنچتا ہے۔[۲۶]

اچھا تو آیئے اصل قصے کی طرف! جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ مئی ۱۹۶۲ء کے پہلے ہفتے میں ایوب صاحب نے ایک دستور نافذ کیا، جس میں نہ تو بنیادی حقوق تھے اور نہ "اسلام کا نام"۔ یعنی ریاست کے نام سے اس لفظ کو ساقط کر دیا گیا۔ ہاں قرآن اور سنت کے اصولوں کا تذکرہ تھا، اور اسلامی طرزِ زندگی (Islamic way of life) کا حوالہ بھی تھا۔

کام یوں چلتا رہتا تو منیر صاحب کی مرادیں بر آتیں۔ مگر ہوا یہ کہ سابق دستور ساز اسمبلی کے رہے سہے عناصر مسلسل زور دے رہے تھے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے اسلامی خدو

---

25 - Munir, *From Jinnah to Zia*, 81.

۲۶- یہاں ایک دلچسپ جملہ سامنے آتا ہے۔ خلاصہ ہے کہ اسلام تو آیا تھا بت پرستی سے نجات دلانے کے لیے مگر مسلمانوں نے خود اسلام ہی کو ایک بُت بنالا۔ کل دوسرا سیکولرسٹ یہ شگوفہ چھوڑے گا کہ مسلمانوں نے تو خدا ہی کو (نعوذ باللہ) بُت بنالیا ہے۔

خال لازماً شامل کیے جانے چاہئیں ایوب اس مطالبے کو روکنے پر قادر نہ تھا۔ سو وہ چیزیں شامل ہوئیں۔[۲۷]

پھر کہتے ہیں:

" بعد ازاں جب میں ایوبی کابینہ کا ممبر تھا اور پولیٹکل پارٹیز بل ایک اجلاس میں زیرِ بحث تھا، ایک شخص نے بل میں ترمیم کرنے کی تحریک کی۔ ترمیم یہ تھی کہ کوئی ایسی پارٹی نہ بنائی جائے، جس کا نصب العین نظریۂ پاکستان کے خلاف پڑتا ہو"۔ اس پر چودھری فصل الٰہی [سابق صدر پاکستان] سیٹ سے اٹھے اور انھوں نے نظریۂ پاکستان پر اعتراض کیا کہ اس کی وضاحت ہونی چاہیے۔ اس پر جس ممبر نے ترمیم کی تحریک اٹھائی تھی، یہ کہا کہ نظریہ پاکستان، اسلام ہے۔ لیکن [منیر صاحب کہتے ہیں] کسی شخص نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ اسلام کیا ہے؟ تجویز میں ترمیم پاس ہوگئی۔"[۲۸]

ہمارا سوال یہ ہے کہ اور کسی کو اگر اسلام کے معنی کسی ڈکشنری میں دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور نہ وضاحت طلب کرنے کی تو ایک منیر صاحب ہی کے دماغ میں کون سے خاص خلیات ایسے لگ گئے تھے جو اسلام اور اس کی ہر چیز کو پہچاننے میں حائل تھے۔ اگر ایسا تھا بھی تو اسلام کے معنی کے متعلق کسی دوسرے کے سوال اٹھانے کے بجاے جج صاحب نے بہ حیثیت رکن کابینہ خود کیوں استفہام فرمایا؟ اور یہی وہ کمزوری ہے جسٹس منیر کی کہ وہ عدالت کی کرسی پر تو شیر ہیں، لیکن مجلس میں بیٹھے ہوں تو خاموش۔

---

[27] - Munir, *From Jinnah to Zia*, 83.
[28] - Ibid,. 25-26.

دیکھیے مزید فرماتے ہیں کہ:

"جہاں اسلام کا نام آجائے تو پھر کوئی شخص اس کے خلاف کوئی بات نہیں کہے گا"۔[29]

کسی دوسرے کا کچھ نہ کہنا تو خیر کمزوری شمار ہوگا، لیکن آپ جیسا بصیرت مند آدمی بھی کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکے تو ہزار افسوس۔ میرا خیال ہے کہ اس موقع پر بھی ایک تحقیقاتی عدالت بہ سلسلہ کاروائی کابینہ لگانی چاہیے تھی۔ اس کی صدارت آپ کرتے تو جس چیز کے چاہتے پرخچے اُڑا دیتے۔

پھر فرماتے ہیں کہ ایوب صاحب کراچی میں تھے۔ واپس آئے تو میں نے اس معاملے پر سوال کیا کہ یہ کیوں ہوا ہے؟ جواب ملا کہ:

" اس سارے معاملے میں دنیا کیا کہے گی؟"[30]

"یہ دنیا کیا کہے گی" کے الفاظ عمومی معنوں کے علاوہ ایک خصوصی مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ان میں جمہوریت بھی بول رہی ہے۔ ایوب صاحب کا مدعا یہ تھا کہ جب چاروں طرف لوگ ایک خاص نقطۂ نظر کے ہوں، کابینہ میں بھی وہ موجود ہوں تو میں تن تنہا اگر کوئی رد وبدل کروں گا تو یہ الزام میری ذات پر آئے گا کہ آمرانہ قوتوں سے کام لے کر میں اسلام کا راستہ روکنا چاہتا ہوں۔

---

[29] - Ibid.
[30] - Ibid.

پھر آگے جو بھٹو صاحب کے دور کا جسٹس منیر نے ذکر کیا ہے کہ منکرات و فواحش کی بندش ہوئی۔ اسلامی قوانین کا اعلان ہوا۔ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو یہی راے عام جمہوری دباؤ تھا جس نے اپنا اثر دکھایا۔

پھر یہاں انتخابات ۱۹۷۷ء کے خلاف تحریک قومی اتحاد اٹھی جس نے ایک بار پھر مسلم عوام کو اس طرح متحرک کر دیا جس طرح وہ تحریک پاکستان یا جہاد دسمبر کے لیے متحرک ہوئے تھے، اس عوامی تحریک میں اتنا زور پیدا ہوا کہ بالآخر ایک دورِ حکومت ختم ہو گیا اور فوج بیچ میں آئی۔ مگر فوج بھی پاکستان کی اسلامی اساسیات کو ختم کرنے کی بجاے ان اساسیات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نہایت ہی مشکل ملکی اور خارجہ حالات میں از سرِ نو دعویٰ لے کر اٹھی۔ رہا یہ سوال کہ کامیابی و ناکامی کے لحاظ سے اس کا کیا مقام ہے تو یہ ایک الگ بحث چاہتا ہے۔

اب تو صرف ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے کہ جسٹس منیر خود سیکولرازم کے علم بردار بن کر اٹھیں اور ایک نئی پارٹی اٹھائیں جو اسلام کے اثرات سے دستور اور سیاست کو خالی کر دے۔

ہے ہمت؟

جسٹس منیر صاحب کی کتاب میں جس طرح صفحہ بہ صفحہ ایک ایک فقرے کئی کئی شگوفے چھوڑے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوا کہ اگر ہر شگوفے پر بات کی جائے تو ایک تو سلسلہ طویل ہو گا، دوسرے تمام کام گفتگو "متفرق" طرز کی ہو جائے گی۔ پس بہتر معلوم ہوتا ہے کہ متفرقات کو چھوڑ کر اہم اصولی بحثوں کو لیا جائے۔

ہمارے محترم جسٹس منیر نے اسلام کے حق میں جو جو بھی کرم فرمائے ہیں، ان کی اصل بنیاد اس پر ہے کہ وہ اسلام کا غیر سیاسی تصور اختیار کرتے ہیں اور اسے سیکولر ریاست کے فریم میں فٹ کر کے دیکھتے ہیں۔

جدید مغربی دورِ تمدن کے تاسیس کرنے والے فلسفیوں اور سیاست کاروں کا یہ کمال ہے کہ ان کے خطوط کے مطابق مسلمانوں پر ظلم و جبر سے جو خالص دنیوی اور لادین حکومتیں مسلط کی گئیں، انھوں نے اپنے نظامِ تعلیم، اپنے معیارِ عزو شرف، اپنے قوانین اور اپنے پروپیگنڈے کے زور سے اسلام کو پوری زندگی کا دین سمجھنے والے مسلمانوں کے ذہن کو جس طرح مسخ کیا، اس کی بہترین معیاری مثالوں میں سے ایک جسٹس منیر ہیں۔ وہ نہ صرف سیکولر تصور کے قائل ہیں بلکہ اس کے پر زور دلائل دیتے ہیں اور علما کے علاوہ اسلام کے بالمقابل کھڑے ہو کر اپنا دعویٰ دھڑلے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ان چند خاصانِ مغربیت میں سے ہیں جو اسلام کو مغربی طرزِ فکر کے سانچے میں ڈھال کر اس کی من مانی شکل بناتے ہیں، مگر یہ جرات نہیں کر سکتے کہ اسلام کے معیار پر دوسروں کے مسلط کردہ افکار کو پرکھیں۔

اصل قضیہ یہ ہے کہ سرے سے وہ نظریہ مذہب (Theory of Religion) کو نہیں جانتے کہ آخر مذہب کس کی طرف سے ہے، وہ کن وجوہ سے قابلِ اعتماد ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں، اس کے برسرِ عمل ہونے سے کیا کیا مفید اور اعلیٰ نتائج انسانیت کو ملتے ہیں۔

مذہب سے پہلے نظریۂ مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ اگر ایک صحیح نظریۂ مذہب ہاتھ آجائے تو پھر دنیا بھر کے مذاہب کو بآسانی اس پر جانچا جاسکتا ہے۔

ہمارا نظریۂ مذہب (یا اگر نظریہ کا لفظ باعثِ الجھن ہو تو ہماری حکمت مذہب یہ ہے):

ا- یہ کائنات ایک خدا کی تخلیق کردہ ہے اور اس میں جتنی بھی مخلوق پائی جاتی ہے وہ سب کی سب اسی کے اقتدار اور قانون کی پابندی ہے، اور اسی وجہ سے اس میں انتہائی کڑا نظم ہے، جس میں بڑے سے بڑے اجرام اور ننّھے سے ننّھے ذرے سبھی جکڑے ہوئے ہیں اور اسی لیے کائنات تخریب کے بجائے تعمیری ارتقا کی طرف بڑھ رہی ہے۔

پس انسان بھی خدا کی مخلوق ہے اور اس کے لیے بھی جس طرح جسم اور نفسیات کے قوانین ہیں، اسی طرح انسانی زندگی کے لیے ایمانی، اخلاقی اور معاشرے و تمدنی قوانین بھی خدا کی طرف سے مقرر ہیں۔ ان مقرر شدہ قوانین کی پابندی میں نظم اور ارتقا ممکن ہے، اور نہ فساد اور تصادم اور تباہی کا خطرہ ہے۔

۲- جس پوری کائنات کا مسلک خدا کی اطاعت (اسلام) ہو اس کی بے شمار مخلوق اور موجودات کے درمیان اگر ایک مخلوق زندگی کے کسی حصے میں، اطاعت و اسلام کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لے تو اسے کائنات میں ایک انمل بے جوڑ پوزیشن حاصل ہو گی۔

۳- انسانی زندگی میں سیکولرسٹوں کے تصور مذہب کے مطابق اگر ذاتی اور نجی اور گھریلوں معاملات میں خدا کی طرف سے مذہبی رہنمائی کی ضرورت ہے تو پھر ان کے مقابلے میں بڑے بڑے سیاسی و معاشی اور یہ بین الاقوامی معاملات میں یہ ضرورت کیوں نہیں ہے۔ اگر ان دائروں میں عقل اپنا راستہ آپ تلاش کرنے پر قادر ہے تو وہ ذاتی اور نجی اور گھریلوں زندگی کیوں نہیں؟

۴- زندگی کے کسی ایک چھوٹے سے دائرے کے لیے خدا کو ماننا اور اس کے مذہب کو قبول کرنا، اور دوسرے بڑے دائروں میں خدائی کو چھوڑ کر اپنی خدائی جمالینا اور اس کے مذہب سے بے نیاز ہو کر اپنا مذہب خود گھڑنا یہ تو شرک کی بدترین صورت ہے۔

اگر کوئی خدا نہیں ہے تو پوری زندگی کو آزاد ہونا چاہیے، اور خدا ہے تو اس کی خدائی کا سکّہ ساری زندگی میں چلنا چاہیے۔

۵- ہماری حکمتِ مذہب یہ ہے کہ خدا کی مرضیات اور اس کے قوانین کو اس کے مقرر کردہ رسول پہچانے آتے ہیں، جو خدائی تعلیم کے تسلسل اور اس کے معیار اور اس کے انداز، نیز اپنے غیر معمولی کردار اور شروع سے آخر تک اپنے لیے بے لوث رویے بلکہ اپنی دی ہوئی قربانیوں کی روشنی میں پہچانے جاتے ہیں۔

خدا کے یہ رسول خدا کے مقرر کردہ نمائندے ہوتے ہیں اور جہاں یہ خدا کی کتابِ ہدایت و حکمت (مع قانون) لاتے ہیں، وہاں یہ اس پر ذاتی طور پر بھی عمل کر کے، اس کے تقاضوں کے مطابق ایک معاشرہ تیار کر کے اور ایک ریاست کی تشکیل کر کے دکھا دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی تعلیم اور اس کا قانون انسان سے کیسی انفرادی، کیسی سیاسی و ریاستی زندگی چاہتا ہے۔

کسی کا یہ منصب نہیں کہ وہ خدا کے رسولوں کی پیش کردہ ہدایت، حکمت، قانون اور نمونہ کار کے ٹکڑے کر کے یہ کہے کہ اس میں فلاں فلاں ٹکڑے تو مجھے قبول ہیں، فلاں قبول نہیں۔ دوسری چیزیں میں کسی اور تمدن سے، کسی اور گروہ فلاسفہ سے، کسی اور تحریک سے قبول کر لوں گا۔

بس یہ ہے بے تکی بات! جو ذہن اس میخ کو اپنے اندر گاڑ لے، پھر نہ وہ مسلمان کی تعریف جان سکتا ہے، نہ کافر کے معنی اس کی سمجھ میں آسکتے ہیں نہ وہ اسلامی ریاست کا نظریاتی ریاست کا تصور خدا کر سکتا ہے، اور نہ یہ راز اس پر کُھل سکتا ہے کہ اسلامی ریاست کا نظریاتی ریاست ہونا چہ معنی دارد؟

ہمارا نظریہ مذہب یہ ہے کہ ایک خدا ہے، اس کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے تمام انسان برابر کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سب کو ایک ہونا چاہیے۔ اور ان انسانوں کو خدا کا مقرر کردہ ایک ہی نظام اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن کی واضح تعلیمات وحدتِ الٰہ وحدت آدم اور وحدتِ دین کے تین نکات دیتی ہے جس سے توحید کا بنیادی تصور قائم ہوتا ہے۔

ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جسٹس منیر کا بنیادی تصورِ مذہب کیا ہے؟

سیکولر تصور مذہب اور اسلامی تصور مذہب کے فرق کی وجہ سے دونوں طرف ریاست کے تصورات الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

مغرب کو عیسائیت سے سابقہ پڑا جس کے پاس نہ تو تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر ثابت شدہ خدا کی کتاب غیر محرف حالت میں موجود تھی، نہ وہ پوری ضابطۂ حیات اس سے اخذ کر سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے تھیوکریسی اور پاپائیت کا راستہ اختیار کیا اور خدا کے قانون کے خلا کو پادریوں کے طبقے نے اول روز سے بھرتے رہنے کی کوشش کی۔ اس طرح خدا کے مذہب کے تھوڑے جزو کے ساتھ پادریوں کا گھڑا ہوا بہت بڑا حصہ مذہب بھی اختیار کر لیا گیا۔ ایسے مذہب کے تحت جب تھیوکریسی قائم ہوئی تو وہ وبال بن گئی اور اس کے خلاف اسلامی اثرات کے تحت ریفارمیشن کی تحریک اٹھی جس نے بعد از خرابی بسیار کلیسا اور ریاست کو الگ کر دیا۔ یوں وہ نیا سیکولر تصورِ ریاست بنا اور اسی طرح غلط ہو کر رہ گیا، جس طرح اس سے پہلے تھیوکریسی غلط تھی۔

یہاں پہنچے کے بعد اسلامی ریاست کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا ہے؟

سب سے پہلے تو میں منیر صاحب کو ایک چکر سے نکالنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ نظریاتی (اسلامی) ریاست کے تصور پر اُپراتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ پہلی بار یہ اصطلاح انھوں نے قادیانی تحقیقاتی عدالت میں سنی تھی، یا پھر صدر ایوب کی کابینہ میں۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جہاں تک اس اصطلاح کا تعلق ہے، تحریک اسلامی کی بالکل ابتدا (۱۹۴۱ء) سے ہر شخص دین کے وسیع تصور میں ریاست کو مضمر سمجھتا رہا ہے اور بارہا تقریروں اور لٹریچر میں نظریاتی یا اعتقادی ریاست کا حوالہ آیا ہے۔ یہاں میرے سامنے ایک مقام ہے جہاں ـــــــــ غیر مسلموں کے حقوق نامی پمفلٹ کی ابتدا ہی میں یہ جملہ درج ہے کہ "اسلام کی حکومت دراصل ایک اصولی (Ideological) حکومت ہے"۔ یہ مضمون ماہنامہ "ترجمان القرآن" بابت اگست ۱۹۴۸ء میں چھپا ہے۔[۳۱]

ایک اور ضروری حوالہ:

".... ہم دیکھتے ہیں کہ وہ [قرآن] لفظِ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے مراد ایک ایسا نظامِ زندگی ہے جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرماں برداری قبول کرے، اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرماں برداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو، موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قرین پہنچ گیا ہے لیکن ابھی اس کو دین کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے۔"[۳۲]

---

[۳۱]- سید ابوالاعلیٰ مودودی، **اسلامی ریاست** (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ۴۰۱۔

[۳۲]- سید ابوالاعلیٰ مودودی، **قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں** (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ۱۰۱۔

پھر سورۂ مومن کی آیت تین پر کلام کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

" قرآن میں قصۂ فرعون و موسیٰ کی جتنی تفصیلات آتی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین مجرد "مذہب" کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ ریاست اور نظامِ تمدن کے معنی میں آیا ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰؑ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا۔ "[۳۳]

مولانا نے مغربی تھیوکریسی اور ریاست اور کلیسا کی تفریق اور سیکولرازم پر بحثیں کی ہیں تاکہ وہاں کے نظریۂ ریاست کا پس منظر واضح ہو جائے۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس موضوع پر کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پنڈت جواہر لال نہرو والی خط و کتابت میں انھوں نے ان مباحث کو جس خوبی اور صراحت سے لیا ہے وہ اس وقت کے ہم جیسے نوجوانوں کے دل و دماغ کو تہ و بالا کر دینے والے تھے۔ فلسفۂ مغرب کی تمام مرعوبیتیں اس شخص کے خیالات سامنے آنے پر ہوا ہو گئیں، اور بہ حیثیت مسلمان اپنے اوپر نوجوان طبقوں کا اعتماد پہلی بار بحال ہونے لگا۔ علامہ اقبال نے اپنی تحریروں میں تجزیہ کر کے بتایا کہ اسلام مغربی اداروں سے ہٹ کر ایک جداگانہ قسم کی ہیئت اجتماعیہ یا ہیئت سیاسہ ہے۔ وہ مسلمانوں کی ہیئت سیاسہ سے مذہب کو کاٹ کر الگ نہیں لے جاتے جو ایک جان کی طرح اس کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

---

[۳۳]۔ مصدر سابق، ۱۰۲۔

ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر میں لکھتے ہیں:

"ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے ....اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت (یا ہیئت اجتماعیہ۔ف۔ ص) کا دار و مدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔"[۳۴]

مزید توضیح ملاحظہ ہو:

"کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجیے وہ بہت متاثر ہو گا، اس لیے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مَس نہیں کیا، جو اس وقت کی روحِ رواں ہے لیکن ذرا اس کے تمدن، اس کے ملک یا پولیٹکل سرگرمیوں کے کسی شعبے کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پر تو خُردہ گیری کر کے دیکھیے، پھر اس کی جبلی عصبیت کا شعلہ نہ بھڑک اٹھے تو ہم جانیں۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیت کا اظہار اس کے معتقدات مذہبی پر نہیں بلکہ جغرافیائی حدود یعنی ملک پر ہے۔.... لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت ایک شے معہود فی الذہن ہے، موجود فی الخارج نہیں ہے بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آکر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اِشراقی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو بُرا کہنا، ہماری آتشِ عصبیت کو برافروختہ

---

[۳۴]۔ محمد اقبال، ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، مشمولہ: **مقالاتِ اقبال**، مرتبہ: سید عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی (لاہور: القمر انٹرپرائزر، ۲۰۱۱ء)، ۱۵۹۔

کرتا ہے۔ میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصّہ سے کچھ کم واجبی نہیں جو اپنے وطن کی برائیاں سُن کر بھڑک اٹھتا ہے۔"[۳۵]

پھر وہ کہتے ہیں:

"مذہب کو فلسفۂ نظری بنانے کے لیے کوشش کرنا میری رائے میں بے سود محض ہے .... بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب یانمونہ پیدا کرکے .... ایک نئی دنیا کو نیست سے ہست کرنا ہے۔"[۳۶]

اور آخر میں کیا خوب کہا:

"اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی اندگی بسر کرتے ہیں۔"[۳۷]

اصل بنیادی بات تو سمجھنے کی یہی ہے کہ اسلام بہ طور کلمہ جامعہ، اسلام بہ طور نقیبِ دعوت، اسلام بہ طور ہیئت اجتماعیہ، اسلام بہ طور سیاسی اسٹیٹ، اسلام بہ طور تحریک انقلاب اور تحریک جہاد ہم پر واضح ہو جائے۔ پھر مسلمان کی تعریف بھی مشکل نہیں، پھر اسے چلانے والوں کے اوصاف بھی متعین ہو سکتے ہیں، پھر اس کا معاملہ مرتدین سے بھی سمجھ میں

---

[۳۵]۔مصدرِ سابق، ۱۶۰-۱۶۱۔

[۳۶]۔ مصدرِ سابق، ۱۶۳-۱۶۴۔

[۳۷]۔ نفسِ مصدر۔

آسکتا ہے، اور اسی طرح تمام دوسرے متعلقہ سوالات واضح ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہر بات کے معانی اور سندات سیکولرازم کی ڈکشنری میں تلاش نہ کی جائیں۔

دور کیوں جائیے سیکولرازم جس نے پہلے مذہب کو نظامِ زندگی سے الگ کر کے رکھا، پھر آہستہ آہستہ اسے دبانا اور کچلنا شروع کیا۔ اور اس کے ساتھ اخلاقی اقدار وروایات بھی درہم برہم ہونے لگیں، آج اسی کی بنائی ہوئی دنیا کو دیکھ لیجیے کہ اس نے مجموعی طور پر انسانوں کو کیا دیا ہے۔ کشمکش، ٹکراؤ، تشدد، جارحیت، خون خرابہ، لوٹ مار، دولت پرستی، کمزوروں سے استحصال عیاشی وفحاشی، کاروباریت، مشینیت، حیوانیت اور بے اطمینانی اور بے مقصدی!

تو اب آپ اس انسانیت سوز عفریت کو دودھ پلانا چاہتے ہیں۔

تحریکِ ریاستِ اسلامی

بہر حال ہم لوگ جنھوں نے جوانی نے اقبال کی فکر سے پرورش پائی۔ اور جنھیں مولانا مودودی سے اسلام کا تحریکی شعور ملا۔ ہمارا حال تو یہ تھا کہ ہم ۱۹۴۰ء سے ہی اپنے دوستوں سے کہتے پھرتے تھے کہ اٹھو اور اسلامی تہذیب کا احیا کریں۔ ہمارے ہاں نظریاتی ریاست (Idiological State) کے دن رات چرچے رہتے تھے۔ آپ ذرا کلمہ طیبہ کے مفہوم کے خزانے کھول کر دیکھیے۔ ایک شخص دنیا کے کسی گوشے میں بیٹھا ہوا کہتا ہے کہ میں ایک خدا کے سوا کسی کے اقتدار، کسی کی قانون سازی کو جائز نہیں مانتا، کسی کی تقسیمِ حلال و حرام اور کسی کی مقررہ حدود کو میں قبول نہیں کرتا۔ محمد ﷺ کے علاوہ کسی کو اپنا قائد

حیات نہیں مانتا۔ اور اسلام کے سوا کوئی ہیئت اجتماعیہ مجھے قبول نہیں، کوئی دوسرا سیاسی و معاشی نظام مجھے گوارا نہیں ہے، کوئی اور تہذیب میرے ایمان کی کسوٹی پر درست نہیں بیٹھتی ـــ تو ایسے شخص کو کیا حیثیت دی جائے گی۔

میں کہتا ہو، جسٹس منیر صاحب! یہ شخص اپنی ذات میں بالقوہ اسلامی ریاست ہے اور اسے وجود میں لانے کے لیے اسلام کی اصلاحی تحریک کا علم بردار ہے۔

یہاں ہم دس بارہ سال تک تحریر و تقریر میں اسلامی اسٹیٹ اور اسلامی انقلاب کی باتیں کرتے رہے۔ ہمیں چھوڑیے، کم سے کم اقبال اور مودودی نے تو حکیمانہ اور مفکرانہ سطح پر اس بحث کو اٹھایا تھا۔ آپ کو واقف ہونا چاہیے تھا۔

مگر ایک جج جس نے مسلمانوں کا پرسنل لا پڑھ لیا ہو اور جس کے ذہن میں یہی تصور راسخ ہو کہ خدا کے انبیا نے مل جل کر اس دنیا کو ایسے لوگ فراہم کیے تھے جو دنیا کی ریاستوں میں بس ذمّی یا اقلیتیں بن کر اپنے پرسنل لا کے مطالبے کرتے رہیں، اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اپنی عدالت کی باہر کی چیزوں کو جاننے کی کوشش کرتا۔

کوئی مسلمان جہاں جہاں بھی پورے شعورِ اسلام کے ساتھ موجود ہے، اس کی زندگی اپنی جگہ ایک محدود سی اسلامی ریاست ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے ایک جماعت کا ضرورت مند ہے، پھر اور آگے بڑھنے کے لیے اسے ایک وطن کی بھی ضرورت ہو گی۔ جہاں وہ اور اس کی جماعت کلمہ طیبہ کی انقلابی تعلیم کو روبعمل لا سکے۔ اور جن تک ایسا نہیں ہو جاتا، ہر مسلم اپنے ماحول کے خلاف حدِ امکان تک مزاحمانہ سرگرمیاں جاری رکھے گا۔ حل یہی

ہے کہ یا تو وہ اپنے ماحول کو بدلنے پر قادر ہو جائے۔ یا عالمی پیمانے پر کسی بھی بڑی تحریک اسلامی کے جہاد میں شامل ہو جائے۔

آج کے اس مبحث کو لکھتے ہوئے میں نے منیر صاحب کی کتاب کی بہت سی جزوی باتیں چھوڑ دی ہیں۔ اور شاید آگے بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ ان کے ہاں متفرق باتیں اتنی ہیں کہ ان سے عہدہ برا ہونے کے لیے ان کی طرح فرصت اور معاشی اطمینان چاہیے۔

بیعت عقبہ میں جو لوگ حضور ﷺ سے بیعت ہوئے اس کا اقرار کر رہے ہیں کہ ہم اپنی جانوں کی ہلاکت اور اموال کی تباہی کے خطروں کے باوجود آپ کا ساتھ دیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ معاملہ صوفیانہ یا فلسفیانہ مذہب یا دھرم کا نہیں ہے، یہ تو ایک تحریک جہاد ہے جس میں ہم شریک ہو رہے ہیں۔ اور مکہ میں مظالم بھگتنے والے نو مسلموں میں سے کون نہیں جانتا تھا کہ یہ ایک انقلابی حرکت کا آغاز ہے جو سارا نقشہ پلٹ دے گی۔